ڈاکٹر محمد تنویر
Guest Faculty, SOL, University of Delhi

رضیہ سجاد ظہیر کے فن میں نسوانی غیرت مندی کی نشاندہی

اردو ادب کی دنیا میں خواتین قلم کاروں کے اگر چہ دیر سے قدم رکھا مگر ان کے قلم نے بڑی تیزی سے توانائی حاصل کی اور ان کی نوک قلم سے نکلنے والے فن پارے بڑی تیزی کے ساتھ قبول عام حاصل کرنے لگے۔ خواتین نے اردو ادب کو مختلف النوع تحریروں سے آراستہ کر دیا۔ افسانہ اور ناول نگاری کا فن عورت کی فطرت سے قریب ہے۔ چنانچہ اس فن میں عورتوں نے بہت جلد اعتبار حاصل کر لیا۔ محمدی بیگم اور بیگم بھوپال سے لے کر طیبہ بیگم، عطیہ فیضی، زہرا فیضی، صغرا ہمایوں مرزا، عباسی بیگم، والدہ افضل علی، نذر سجاد حیدر وغیرہ نے ناول اور افسانوں میں خاص شہرت حاصل کی۔ ان کی تحریروں میں موجود، گھریلو زندگی کے حقیقی مسائل، خانگی مشکلات، مذہبی اور تہذیبی قدریں، ہلکا سا رومانی انداز اور اصلاحی نقطۂ نظر آج بھی دلوں میں سوزش پیدا کرنے اور ذہنوں کو غور و فکر کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ان خواتین نے فن کے معیار اور اصولوں کا مطالعہ نہ کیا تھا، نہ ہی کردار نگاری کی باریکیوں سے کماحقہٗ واقف تھیں۔ اس کے باوجود انھوں نے افسانے اور ناول کے فن کو ترقی دینے میں بڑا کردار ادا کیا۔ ان خواتین نے اپنی ذہنی اختراع اور شعور کی بنیاد پر تخلیق کے ایسے نمونے پیش کیے جس میں بقول صالحہ عابد حسین ''عورت کا دل دھڑکتا ہے''۔

رضیہ سجاد ظہیر جس زمانے میں قلم و قرطاس کی طرف مائل ہوئیں اس وقت ایک طرف بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے کے افسانوں اور ناولوں کا رومانوی طرز تھا تو دوسری طرف پریم چند کی حقیقت نگاری، قومی اور وطنی جذبات سے مملو ناول اور افسانے تھے۔ کسانوں اور مزدوروں کا احتجاج تھا، دیہی زندگی کے مسائل تھے، نچلے طبقے سے ہمدردی تھی۔ یہ سب ادب میں پہلی بار شامل ہو رہا تھا۔ ترقی پسند تحریک

کے قیام کے بعد ادیبوں نے کھل کر عوام کی حمایت میں ناول، افسانے اور شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ رضیہ سجاد ظہیر بھی روشن خیال خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ مظلوموں کی حمایت کا کام کیا۔ اور مظلوم طبقے، بالخصوص عورتوں کو اپنے حقوق کو پہنچاننے اور اسے حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنے کی طرف راغب کیا ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر ہمیشہ سے اجتماعیت، روشنی اور امید کی قائل رہیں۔ ناامیدی، تنہائی، انفرادیت جیسے موضوعات سے انھوں نے دانستاً خود کو دور رکھا۔ جدیدیت کی تحریک کے زیر اثر جب ادیب جوق در جوق ان موضوعات کی طرف رجوع کر رہے تھے، تو انھیں تکلیف ہوئی۔ انھوں نے ترقی پسند خیالات کا دفاع کرتے ہوئے کسی قدر جارحانہ انداز میں لکھا:

> ''کچھ ادیبوں کا حال ہی میں یہ نظریہ بھی بن گیا ہے کہ ادیب کی کسی سماجی ادارے سے وابستگی اس کو نقصان پہنچاتی ہے۔۔۔ ابھی اس طرح کے انفرادی و محرومی کے عکاس ادب کی عمر بہت کم ہے، اس لیے اس کے مستقبل کے متعلق تو کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ رجحان ایک قراری کیفیت بن سکتا ہے۔ لوگوں میں مایوسی اور قنوطیت پیدا کر سکتا ہے۔ خارجی عناصر سے الگ کر کے اپنے آپ میں ہی پیچ و تاب کھاتے رہنے پر آمادہ کر سکتا ہے، احساس کے بعد عمل کے منطقی راستے سے ان کو ہٹا کر زندگی کی قوت اور حرکت کی برکت سے علاحدہ کر کے موت کو ہر مسئلے کا حل بنا کر پیش کر سکتا ہے۔ ہر ذی شعور یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ رجحانات کس قدر فضول اور ساتھ ہی خطرناک ہیں۔ شکست خوردگی، جھلاہٹ، فرار اپنی ذات میں الجھتے رہنا کسی ادیب کو زیادہ آگے نہیں لے جا سکتا۔''[1]

کسی سماجی ادارے سے وابستگی ادیبوں کے حق میں مفید ہو یا مضر ہو، لیکن رضیہ سجاد ظہیر کی یہ بات دل کو لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ادب میں محض انفرادی و محرومی کی عکاسی ادیب کے سماجی اشتراک اور عمومی مشاہدے پر سوالیہ نشان لگاتی ہے۔

رضیہ سجاد ظہیر کو فکشن کی دونوں اصناف ناول اور افسانہ، میں شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے ادبی کارناموں میں ''اللہ میگھ دے'' (ناول)، دیوانہ مر گیا (نامکمل ناول)، ''زرد گلاب'' (افسانوی مجموعہ)، ''اللہ دے بندہ لے'' (افسانوی مجموعہ)، ''امن کا کارواں'' (رپورتاژ) اور متعدد تراجم شامل ہیں۔ انھوں نے

عورتوں کے گھریلو مسائل کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔عورتوں کی پسماندگی، سماجی پستی اور غیر ضروری رسم و رواج کے ذریعہ ان کے استحصال کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ان موضوعات کے انتخاب میں رضیہ سجاد ظہیر کی روشن فکری اور دردمندی ہی محرک بنی۔انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں عدم مساوات، عصبیت، شکست خوردگی، بے بسی کے ساتھ ذہنی پستی اور توہم پرستی کو بھی اجاگر کیا ہے۔رضیہ سجاد ظہیر ہر چند ادب میں مظلوموں کی حمایت کی قائل ہیں مگر ان کے یہاں یہ حمایت کوری نہیں ہے بلکہ ہر وہ اپنی جانبداری کو بجا ثابت کرنے کے لیے افسانے میں کوئی نہ کوئی منطقی استدلال بھی رکھتی ہیں۔جس کی وجہ سے ان کے نظریے کو نہ صرف جذبات بلکہ عقل کی تائید بھی حاصل رہتی ہے۔''لنگڑی ممانی''ایک حسین اور پاکباز دوشیزہ کی کہانی ہے۔وہ ساری زندگی اس لیے دکھ جھیلتی ہے کہ کیونکہ شادی والے دن ہی اس کا دولھا گھوڑے سے گر کر مر گیا تھا،اس لیے معاشرے کے قانون کے مطابق لنگڑی ممانی کو ساری زندگی بیوہ رہنا تھا۔کچھ عرصے بعد خاندان کا ایک فرد اس کے حسن پر فریفتہ ہو گیا لیکن رسم و رواج اور سماجی جکڑ بندیوں کی وجہ سے ناکام رہا۔رضیہ سجاد ظہیر کے اس افسانے میں کوئی بڑا فلسفہ نہیں ہے بلکہ ایک ہنستی کھیلتی زندگی کو عذاب بنتے دکھایا گیا ہے جس کی وجہ،سماج کی چند فرسودہ رسمیں ہیں جن کا انسداد کرنا ہر ذی ہوش کی نظر ضروری ہوگا۔

عورتوں کے مسائل پر احتجاج کا رویہ ان کے افسانے''نیچ''میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس میں انھوں نے عورت کی آزادی اور معاشرتی برابری کے لیے آواز بلند کی ہے۔اس کہانی کی اہم کردار شاملی ہے۔وہ محنت اور مزدوری کرنا گوارا کر لیتی ہے مگر اپنے ضمیر پر کسی طرح کی چوٹ کو برداشت نہیں کرتی۔اس کا شوہر اسے روٹی کپڑے کے لیے طعنے مارتا ہے جس سے شاملی کی خودداری مجروح ہوتی ہے۔بالآخر وہ اپنے شوہر کو بھی خیر باد کہہ دیتی ہے۔شاملی کی زندگی میں یہ حادثہ دو بار ہوتا ہے اور وہ دونوں بار ہی ایسے مردوں سے علاحدگی اختیار کر لیتی ہے جو اس پر کسی بھی طرح کا احسان دھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس کے یہ باوقار جملے ملاحظہ ہوں:

> ''۔۔اگر وہ زندہ ہے بھی تو کیا ہوا،میرے لیے تو وہ مر ہی گیا ہے۔۔وہ سمجھتا تھا کہ روٹی کپڑا دے گا اور اپنا حکم چلائے گا،ہم کوئی پتریا ہیں کہ روپے پیسے سے مول لے گا ہمیں، ہمارے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں،اس جیسے دس کو کھلانے کی ہمت رکھتے ہیں ہم۔''[۲]

دوسرے مرد سے علاحدگی کے بعد کے یہ جملے ملاحظہ ہوں:

''وہ اپنی سرکاری نوکری سے الگ تو نہیں ہوا بی بی جی وہ بار بار مجھ سے کہتا تھا کہ تیرے کارن میری سرکاری نوکری چھٹنے والی ہے، مجھ پر احسان دھرتا تھا۔ آپ بتایئے کیا میں نے اس سے کہا تھا کہ سرکاری نوکری کر، مجھے اس کی نوکری سے پریم تھا کیا؟ ہوں جانے اپنے کو کیا سمجھتا تھا، بار بار یہی کہ نوکری چھوٹ جائے گی تو تجھے کیا کھلاؤں گا؟ اگر اس کے گھر بیٹھ جاتی عمر بھر یہی طعنے دیتا، اور کھانے کا کیا ہے اس جیسے دس کو کھلانے کی ہمت رکھتے ہیں ہم۔''[۳]

بظاہر اس سخت رویے کے باوجود شاملی کے اندر ایک عورت کا دل ہے جس میں عورت کا جذبۂ ترحّم موجیں مارتا ہے، رضیہ سجاد ظہیر اگرچہ ماہر نفسیات نہیں تھیں لیکن اس کیمیا کو جانتی تھیں کہ عورت کتنی بھی سخت ہو جائے اپنی محبت کو یکسر نظر انداز نہیں کر سکتی۔ جس طرح امراؤ جان ادا اپنے گلچین اول کی سفلہ مزاجی سے نفرت کرنے کے باوجود کڑھ کڑھ کر اس کی مدد کرتی ہے ایسا ہی کچھ حال شاملی کا بھی ہے۔ یہ سطریں ملاحظہ ہوں:

''شاملی کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئی اس کی بڑی بڑی کٹیلی آنکھوں میں لبالب آنسو بھر آئے۔ دیر تک بیٹھی روتی رہی۔ پھر دھیمی آواز میں اس نے کہا:

''رام اوتار ٹھیک تو ہے بی بی جی، اس سے میرا سلام کہہ دیجئے گا۔''[۴]

ایسے موقعوں پر معمولی افسانہ نگار کی ساری توجہ احتجاجی لہجے کو مزید سخت کر کے باغیانہ تیور بنا دینے میں صرف ہو جاتی ہے، مگر رضیہ سجاد ظہیر نے ایک تجربہ کار ادیبہ کی مثال پیش کرتے ہوئے، اس موقع پر شاملی سے ایسے جملے ادا کرواتی ہیں جس سے نہ صرف شاملی کردار کا ایک اور پہلو روشن ہوتا بلکہ قارئین کی ہمدردی بھی اس کردار کے ساتھ جڑ جاتی ہے۔ یہ کردار نگاری کی وہ باریکیاں ہیں جن کی سمجھ اور اس کے برمحل استعمال کا گُر باکمال فنکار کو ہی حاصل ہوتا ہے۔

رضیہ سجاد ظہیر عورت کو خود کفیل دیکھنا چاہتی ہیں۔ عورت بچپن سے جوانی تک والدین کی دست نگر ہوتی ہے، شادی کے بعد شوہر کی کفالت میں اور بوڑھی ہونے پر بچوں کی مرہون منت ہو جاتی ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر کو عورت کی اس مجبور کا احساس تھا ساتھ ہی اپنی خواہش کی تکمیل کی تمنا بھی تھی۔ چناچہ انھوں نے اپنے ایک افسانے ''لاوارث'' کے ذریعہ اس گمان کو توڑ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر عورت چاہے تو شادی سے قبل بھی اپنی محنت اور اعتماد کے دم پر جی سکتی ہے اور شادی کے بعد بھی۔

رضیہ سجاد ظہیر کا قلم طبقاتی تقسیم اور نو دولتیوں کے ظلم و جبر، استحصال کے خلاف پوری توانائی سے جنگ کرتا نظر آتا ہے۔ وہ پوری زندگی سماج کے ستائے ہوئے، دبے کچلے لوگوں کے لیے اپنے فن کو بروکار لاتی رہیں۔ وہ ایک ایسے سماج کا خواب دیکھتی تھیں جہاں عورتیں کسی شخص کی محتاج نہ ہوں۔ وہ اپنے خاوندوں کی دست نگر بن کر نہ رہ جائیں۔ رضیہ کی طبیعت میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ نہایت بیدار مغز اور دور اندیش خاتون تھیں، جس کی جھلک ان کے افسانوں میں بار بار دیکھنے کو ملتی ہے۔ معاشرے کی ایک بڑی کریہہ خرابی مطلقہ عورتوں کی تذلیل کا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مطلقہ عورتوں کو معاشرے میں وہ عزت حاصل نہیں ہوتی جو عام طور سے ہونی چاہیے۔ سماج میں تعلیم کے فروغ سے صورتحال کچھ تبدیل ضرور ہوئی ہے مگر ابھی بھی عورتوں پر بے جا ظلم و تشدد، استحصال، طعن و تشنیع اور تذلیل کے واقعات کثرت سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ توہم پرستی کی وجہ سے بیواؤں اور طلاق شدہ عورتوں کو منحوس اور بدنصیب کی صف میں رکھا جاتا ہے۔ رضیہ کی کہانی ''نگوڑی چلی آوے ہے'' اس برائی کے استیصال کی اچھی کوشش ہے جس میں کہانی کے کردار جلو خالہ کے پردے میں انھوں نے معاشرے کی حقیقی تصویر دکھائی ہے۔ جلو خالہ کو سماج میں کئی جگہ شخصی امتیاز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس امتیاز کو برتنے میں سماج کے مرد ،عورت سب شامل ہیں بلکہ بسا اوقات عورت زیادہ سخت معلوم ہوتی ہیں۔ جلو خالہ کو ایک مذہبی جلسے میں کس طرح کی ذلت اٹھانی پڑتی ہے اس کی مثال مندرجہ ذیل جملے ہیں:

''اے ہٹاؤ کوئی اس اللہ کی ماری کو، خصم چھٹنی مجلس کی رقت بگاڑ رہی ہے۔''

۔۔اور جلو خالہ شرمندگی محسوس کرتے ہوئے چپکے سے اٹھ کر کھسک گئیں۔''۵؎

رضیہ سجاد ظہیر کی کہانیوں میں جذبات نگاری بڑی عمدہ ہوتی ہے۔ جذبات مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ہنگامی قسم کے تیز و تند جذبات کی عکاسی کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے مگر ان کیفیات اور جذبات کو بیان کرنا آسان نہیں ہوتا جو بڑی سبک روی سے کردار میں پیدا ہوتے ہیں اور کردار کی ظاہری حالت میں نمایاں تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔ رضیہ سجاد ظہیر یہاں بھی بہت کامیاب نظر آتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں موجود مختلف طبقوں کے کردار، ان کی جذبات نگاری، ان کے بات چیت کا انداز، لہجے کے نشیب و فراز کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رضیہ نے انھیں کرداروں کے ساتھ زندگی گزاری ہے، انھیں میں پلی بڑھی ہیں اور ان کے رگ و ریشے سے واقف ہیں۔ بڑی بات یہ

ہے کہ رضیہ سجاد ظہیر نے صرف مسائل کی نشاندہی پر ہی اکتفا نہیں کر لیا ہے بلکہ حتی الامکان ان مسائل کے تدارک کی راہ بھی دکھائی ہے۔ عصمت چغتائی ان کے لیے اس طرح لکھتی ہیں:

> رضیہ سجاد ظہیر کے قلم سے ہمیشہ زہر کے بجائے امرت ٹپکا، وہ امرت جو زہر کا کاٹ ہے۔ رضیہ کے ناولوں اور کہانیوں کے کردار بالکل مصنفہ کی طرح مخلص صاف گو اور صاف ستھرے ہوتے ہیں، سب ہی کردار بہت جانے پہچانے۔ جسم فروشی کے مسئلہ کو رضیہ کی تحریروں میں شاید کبھی اہمیت نہ حاصل ہوئی ہو، جسم سے زیادہ اہم جذبات اور احساسات ہیں۔ تند اور تیز نہیں بڑے دھیمے دھیمے، بڑے معصوم، جن کی توڑ پھوڑ نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ زندگی کی تلخیوں، محرومیوں اور پریشانیوں پر ذرا سا بسورنے کے بعد کھلکھلا کر ہنس دینا، نہ کسی سے شکایت نہ گلہ۔''[۶]

رضیہ سجاد ظہیر کے متعلق میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ان یہاں مظلوم طبقہ کی حمایت کا رویہ عام ہے مگر ان کی یہ حمایت اس وقت، ہمدردی و اپنائیت سے مملو وارداتی بیان میں تبدیل ہو جاتی جب وہ عورت کے کسی مسئلے کو اپنی کہانی میں پیش کرتی ہیں۔ ان کے فن کا ایک بڑا حصہ عورتوں کے سماجی اور معاشرتی حقوق کی پیروی میں صرف ہوا ہے۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ عورتوں کے مسائل ان کا مرغوب موضوع ہے اور ان مسئلوں کا تصفیہ ان کے فن کا مقصد۔

☆☆☆

حواشی

۱۔ ''منتخب ہندوستانی افسانے'' مرتبہ رضیہ سجاد ظہیر، ص۔ ا

۲۔ ''نیچ'' از رضیہ سجاد ظہیر

۳۔ ''نیچ'' از رضیہ سجاد ظہیر

۴۔ 'نیچ'' از رضیہ سجاد ظہیر۔

۵۔ ''نگوڑی چلی آوے ہے'' از رضیہ سجاد ظہیر

۶۔ 'اردو ناول نگار خانہ' از کے۔ کے۔ کھلر، ص 88، سیمانت پرکاشن، نئی دہلی 1988

☆☆☆